Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:1,2 (2008)

فکر و نظر............ اسلام آباد　　　　جلد: ۴۶　　شمارہ: ۲،۱

گُم اس میں تھے آفاق: حسرت موہانی☆

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی

''حسرت کی موت ایک عظیم شخصیت کی موت ہے۔ وہ جتنے بڑے تھے اتنی ہی ناکام تھے۔ ان کی ناکامی ہی ان کی شخصیت کا حسن تھی۔ کتنا بے حجاب تھا اس کا یہ حسن کہ اب تک اسے پہچانا نہ گیا۔ اسے کوئی باسول نہ ملا جو دنیائے ادب کے لیے اس کی زندگی کا حسن چرا سکتا اور کوئی سوانح نگار اس کی جیتی جاگتی تصویر نہ بنا سکا۔ اسے کوئی بھی گرفتار نہ کر سکا۔ موت بازی جیت گئی۔ قیامت کی ناکامی تھی۔ خود ناکام رہا، دوسروں کو بھی ناکام چھوڑ گیا''۔

حسرت کے بارے میں ان خیالات کا اظہار میرے ایک دوست نے کیا۔ یہی میں نے بھی سوچا اور ممکن ہے آپ بھی اسی طرح سوچ رہے ہوں۔ حسرت مر گئے اور ایک عظیم الشان سوانح عمری مرتب ہونے سے رہ گئی لیکن ان کی تأثراتی سوانح عمر اب بھی لکھی جا سکتی ہے۔ ایک ایسی سوانح عمری جو پڑھنے والے کے دل میں حسرت سے پیار کرنی کی تمنا پیدا کرے اور جس میں وہ اپنی جھینگر جیسے آواز میں ترکی ٹوپی اور بوسیدہ اچکن کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں۔

یہ مختصر مضمون ادائیگی فرض کے لیے ہے ورنہ حسرت کی ہمہ گیر اور عظیم شخصیت اس چھوٹے سے آیئنے میں مقید نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تو ''آئینہ خانہ'' چاہئے تاکہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہو سکے۔

جب کبھی میں نے حسرت موہانی کی جرأت، ایثار، سادگی، صداقت اور یقین وعمل کے متعلق سوچا تو یہی خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ وہ قرون اولیٰ کے سرفروش مسلمانوں اور مجاہدوں کے قافلے کے ایک بچھڑے ہوئے فرد ہیں جو نہ جانے زمانے کی گردش کے کس قانون کے تحت ہمارے عہد میں آ گیا آخر وہ اسی قافلے سے جا ملے۔

حسرت کی زندگی ایک طرفہ تماشہ تھی۔ کتنے ہی تضاد ان کی شخصیت میں مل کر ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی تھی حسرت کی زندگی۔ وہ کمال خاکساری کا نمونہ تھے لیکن ایسی ''قیامت'' بھی تھی جو اپنی داد خود دے لے۔ ان کی غزل پڑھئے تو ''جس سے جگرِ لالہ میں

☆　شخصی خاکوں پر مشتمل ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی کتاب ''یہ لوگ بھی غضب تھے'' سے ماخوذ

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.　http://iri.iiu.edu.pk/

ٹھنڈک ہو وہ شبنم'' اور زندگی پر نظر ڈالئے تو ایک چٹان اور ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان''۔

میں نے اپنے بچپن سے نوجوانی تک حسرت کو ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ کبھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ پیروں میں اکثر باٹا کی سیاہ سلیپر، ہاتھ میں چھڑی، جیبی گھڑی، شیروانی اکثر بوسیدہ، پہلے زیادہ تر بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ یا کبھی کبھی گول سیاہ ٹوپی۔ ۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ دوپلی ٹوپی پہننے لگے۔ عینک لگاتے تھے۔ مگر عینک کا ٹھاٹھ یہ تھا کہ دونوں کمانیوں کی ساخت اور رنگ جداگانہ یا ایک طرف کمانی اور دوسری طرف دھاگا بندھا ہوا۔ حسرت کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے قدرت نے انہیں ہر نعمت سے محروم رکھا ہے۔ نہ حسن ہے نہ دولت، چہرے پر چیچک کے داغ، گردن نہ ہونے کے برابر۔ آواز نسوانی لیکن تمام نسوانی لطافتوں سے عاری اور شاید اسی مضحکہ خیز آواز کی وجہ سے حسرت کو ان کے دور طالب علمی میں علی گڑھ کے ساتھی ''خالہ اماں'' کہتے تھے۔ مگر قدرت ظالم نہیں، اس نے حسرت کو اخلاق اور کردار کی ان خوبیوں سے سرفراز فرمایا تھا جو اس دور کی شاید ہی کسی اور شخصیت میں اس شدت کے ساتھ ملیں۔ جب عشق، استقلال، خود داری، عزم، جذبہ آزادی، غیرت اور علم و عمل یہ سب چیزیں ایک شخصیت میں جمع ہو گئیں تو حسرت نام پایا۔

مولانا کی زندگی کا سب سے واضح پہلو ان کا استقلال، جرأت اور مقصد کی وحدت ہے۔ وہ پوری جرأت اور استقلال کے ساتھ آزادی کے مقصد کے لیے ساری عمر جہاد کرتے رہے۔ اسی وحدت مقصد نے انہیں آرنلڈ کا اسکالر جیپسی بنا دیا۔ مولانا کے اسی استقلال کو ضد اور ہٹ دھرمی کا نام بھی دیا گیا۔ ایک دن مولانا ذرا اچھے موڈ میں تھے میں نے ان سے کہہ ہی دیا کہ ''مولانا بہت سے لوگ آپ کو ضدی کہتے ہیں''۔ مولانا مخصوص انداز میں ہنسے، پھر بولے ''نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ جسے کچھ لوگ ضد کہتے ہیں دوسرے لوگ اسی بات کو مستقل مزاجی کہتے ہیں''۔

حسرت جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کی حمایت وہ آخر تک کرتے خواہ ساری دنیا ہی ان کے خلاف ہو جاتی۔ جب درجۂ نو آبادیات مانگا جاتا تھا اس وقت حسرت نے آزادئ کامل کا مطالبہ کیا۔ اور جب ملک میں آزادئ کامل کے نعرے گونج اٹھے تو حسرت نے مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی۔ ان کے پرانے رفیق ناراض ہو گئے۔ انہیں سنکی کہا گیا، مگر چٹان بے نیازی سے کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کی سربلندی دور افق کے نظارے دیکھ رہی تھی۔

حیدرباد دکن میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ سبط حسن، سجاد ظہیر اور کرشن چندر وغیرہ نے

ایک تجویز پیش کی جس کے ذریعے فحش ادب کی مخالفت اور مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ ترقی پسند ادب اور جدید فحش ادب دو الگ چیزیں ہیں اور ترقی پسند ادیبوں کو فحش نگاری سے بچنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی مستحسن تجویز معلوم ہوتی تھی اور خیال بھی نہ تھا کہ اس تحریک کی بھی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب یہ تجویز پیش کی گئی تو حسرت اٹھے، ان کی چنچناتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور اس پست آواز نے بھی مجمع میں سکوت پیدا کر دیا۔ حسرت نے باوجودِ دعویٰ اتقا اس تجویز کی مخالفت کی۔ مولانا نے کہا کہ ''یہ سب واہیات بات ہے۔ ادب اور شاعری سچے اور شدید جذبات کا اظہار ہے۔ شاعر جو کچھ شدت کے ساتھ محسوس کرے اسے کہنے کا حق ہے۔ فاسقانہ جذبات بھی شاعری کا حصہ ہیں۔ یہ احتساب بالکل غلط ہے''۔ سبط حسن بولے یار یہ بڈھا بھی خوب ہے۔ کانگریس میں تھا تو آزادی کامل کا مطالبہ کرتا رہا۔ پھر پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور آج اپنا پڑا کر دیا۔

۱۹۴۸ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ لسانی مسائل پر غور کرنے اور اہم فیصلے کرنے کے لیے کانفرنس کا ایک اجلاس مخصوص تھا۔ بدلے ہوئے حالات اور نئی مصلحتوں نے مقرروں اور ادیبوں کے لہجے کو بدل دیا تھا۔ اور ''ہندوستانی'' ثقافت اور زبان کا پرچار اس اجلاس میں بڑے شدومد کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ قاضی عبد الغفار نے اپنے خطبہ میں ہر تہذیبی اور تمدنی خطرے اور نقصان کا سبب تخلیقِ پاکستان کو قرار دے کر خوب خوب اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اس فضا اور ماحول میں جب حسرت تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اجلاس کا رخ ہی بدل گیا۔ مصلحت پسندوں کے چہروں پر زردی چھا گئی۔ مولانا اسی بے باکی سے بولے جس کا تصور آج بھی ان کی ذات سے وابستہ ہے۔ کہنے لگے کہ یہ ہندوستانی محض بکواس ہے۔ ہم اردو بولتے ہیں اور اردو بولیں گے۔ کسی حکومت کو کسی قوم یا فرقے کے ان مسائل میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہاں ہماری تہذیب و تمدن کے ساتھ دشمنی برتی جا رہی ہے۔ میں اردو کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے کر جاؤں گا اور لیک سکس میں مدبرین اقوامِ عالم کو اس مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کروں گا''۔

میں نے محسوس کیا کہ جب مولانا ہال میں تقریر کر رہے تھے اس وقت مصلحت پسند چہروں پر بے زاری اور مایوسی کے علاوہ حقارت اور نفرت کی لہریں بھی تھیں اور اس طرح حسرت کی حق پسندی نے کچھ نئے مخالف مول لے لیے۔ بعد میں ڈاکٹر علیم اور قاضی عبد الغفار نے مولانا کی تقریر کی ''اہمیت'' کو کم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا ہر لفظ دلوں میں نقش ہو چکا تھا۔ اور آج بھی ان کی آواز، ذہن کی وادیوں میں گونج رہی ہے۔

مولانا اردو کے مسئلہ کو اقوام متحدہ تک لے جانا چاہتے تھے۔ انہیں یہی لو لگی ہوئی تھی۔ اور وہ ایک طویل سفر کرنا چاہتے تھے سارے براعظم یورپ کا۔ ایک دن مولانا کہنے لگے ''میں چالیس ہزار روپیہ جمع کر رہا ہوں۔ اور پھر میں یورپ کے ایک ایک ملک کا دورہ کر کے اس نام نہاد جمہوریت اور آزادی کے پردے کو چاک کردوں گا'' حسرت اس سفر کے لیے روپے جس طور پر جمع کر رہے تھے وہ بھی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ وہ یوپی کی مجلس دستور ساز اور ہندوستانی پارلیمان کے رکن تھے۔ ان دونوں اداروں سے انہیں رکنیت کی ماہانہ اعزازی تنخواہ ملتی تھی۔ اور اجلاس کے دنوں میں روزانہ الاؤنس ملتا تھا۔ (یوپی اسمبلی سے غالباً دس روپے یومیہ اور پارلیمان سے تیس روپے یومیہ)۔ مولانا اسی رقم سے سفر کے اخراجات پس انداز کر رہے تھے۔ دہلی میں وہ کسی ہوٹل یا کسی دوست کے ساتھ نہیں ٹھہرتے تھے۔ بلکہ ایک مسجد کے حجرے میں پڑے رہتے۔ وہیں وہ دستوری مسائل پر بحث کرتے۔ اخباروں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کرتے اور پھر یادِ خدا بھی۔ بعد میں وہ مولانا مظہر الدین کے ہاں ٹھہرنے لگے تھے۔ مولانا کو اس خیال ہی سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ وہ بھارتی حکومت کے روپے سے اپنے مقصد کے لیے سفر کرنے والے تھے۔ شاید اسی لیے مولانا حتی الامکان کسی بھی اجلاس سے غیر حاضر نہ ہوتے تھے تاکہ ان کی حاضری کا معاوضہ ملتا رہے۔ یوں بھی ہوا کہ مولانا اسمبلی میں پہنچے۔ اپنی نشست پر اظہار حاضری کے لیے اپنی مخصوص ٹوپی رکھ کر چلے گئے۔ اور لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتے رہے، یا دوستوں سے ملنے چلے گئے، یا امین آباد کے کسی چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

مولانا کی جرأت اور بے باکی کا ایک اور اہم واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں الہٰ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ سیشن ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کی تجویز سبجیکٹ کمیٹی نے نامنظور کر دی۔ اور آئینی طور پر مولانا کو کھلے اجلاس میں وہ تجویز پیش کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن کھلے اجلاس میں مولانا بضد ہوگئے کہ وہ تجویز ضرور پیش کریں گے۔ قائداعظم ایک آئین پسند شخصیت تھے۔ لیکن انہوں نے حسرت کو تجویز پیش کرنے کی اجازت دے دی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں حسرت کے لیے کس قدر عقیدت اور محبت تھی۔ تجویز کا تعلق غالباً خود قائد اعظم کی ذات تھا۔ مولانا کی تقریروں پر لوگوں نے شور مچایا۔ پنڈال کے مختلف گوشوں سے ان پر پھبتیاں کسی گئیں۔ لیکن یہ سیل رواں کسی کے روکے کیا رکتا۔ مولانا بولتے ہی رہے ''اگر ایک بڑھیا فاروق اعظمؓ کا گریبان پکڑ سکتی تھی۔ تو کیا میں قائداعظم سے باز پرس نہیں کر سکتا''۔ لوگوں کا شور بڑھتا ہی گیا۔ اور قائداعظم بڑے

باوقار انداز سے اٹھے اور انہوں نے کہا ''مولانا صاحب کو بولنے دو''۔ یہ واقعہ جہاں حسرت کی جرأت کو پیش کرتا ہے وہاں اس سے بابائے ملت کی جمہوری مزاج کی نقاب کشائی بھی ہوتی ہے۔

حسرت کبھی کسی سے نہ دبے۔ وہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی شخصیت سے ٹکرا گئے۔ ہندوستان کے بعض بہت ہی بڑے رہنماؤں کے متعلق ان کی اچھی رائے نہیں تھی۔ تلک اور سی آر داس سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ اور قائداعظم کے خلوص کے وہ بہت مداح تھے۔ لیکن مسلم لیگ کے بعض مقتدر رہنماؤں سے حسرت کو بڑی نفرت تھی۔ وہ اکثر یہ بات دہراتے ''قائداعظم بہت اچھے ہیں شیطانوں کے درمیان گھر کے رہنے کے باوجود ان کی قدسی نفسی مجروح نہیں ہوتی''۔

حسرت ذہنی طور پر حضرت امام حسینؓ سے بے حد متأثر تھے۔ وہ امام مظلومؓ کو انسانی کردار کی بلند ترین مثال سمجھتے تھے۔ ان کی ساری زندگی اسی رنگ میں گزری۔ وہ غلبۂ اعداء سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ وہ آخر دم تک ''دیار غیر'' میں حق کو آواز بلند کرتے رہے۔ ہندوستان کے ایوان دستور ساز کے قلب میں آج بھی حسرت اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میں غلبۂ اعداء سے ہراساں نہیں حسرت
ہے مدنظر شیوہ حسینؓ ابن علیؓ کا

حسرت کے کردار میں غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا تھا۔ ان کا طریق امیری نہیں فقیری تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی خودی کی حفاظت کرتے ہوئے غریبی میں نام پیدا کیا۔ حسرت کو بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن مرحومہ بیگم حسرت موہانی نے ہمیشہ انہیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ گھریلو زندگی کی آسائش اور خانگی سکون کے لیے انسان کبھی کبھی اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ لیکن حسرت کی زندگی اس باب میں بہت ہی خوشگوار تھی۔ مولانا نے ایک دفعہ مرحومہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''وہ زمانہ ہمارے خاندان کے لیے نازک ترین زمانہ تھا۔ گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور کھانے کے لالے پڑگئے تھے۔ (میں) انگریزی حکومت کا معتوب تھا۔ اسی لیے لوگ ملتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ یہ کٹھن آزمائشی دور تھا۔ اس وقت مجھے انگریزی حکومت کی طرف سے ڈپٹی کلکٹری کی پیشکش کی گئی بشرطیکہ میں سیاست سے دستبردار ہو جاؤں۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ لیکن متعلقین کی حالت دیکھ کر میرے قدم لڑکھڑا گئے اس وقت بیگم نے مجھے تسلی دی اور یہی مشورہ دیا کہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا دوں''۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اور ان کی آواز میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ مرحومہ بیگم حسرت کتنی ذی شعور اور صابر خاتون تھیں۔ حسرت کی زندگی کا

ہر گوشہ ان ہی کے نور سے منور تھا۔ اور یہی ان کی شاعری میں بھی جگہ جگہ چمک اٹھتا ہے۔

مولانا حسرت ایک مرتبہ حیدر آباد دکن گئے ہوئے تھے۔ بعض امراء اور درباریوں کی تحریک پر نظام دکن نے مولانا کو دو سو روپے ماہانہ ادبی وظیفہ دینا طے کیا اور انہی امراء کے ذریعہ اشارتاً مولانا سے کہا گیا کہ وہ دربار شاہی میں حاضری دیں۔ مولانا کی طبعِ غیور کو خیرات شاہی کا یہ انداز پسند نہ آیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے پر اس مرتبہ دکن چھوڑ دینے کو ترجیح دی۔ اور جب کانپور لوٹے تو انہوں نے کہا ؎

رہ گئی شرمِ بے کسی حسرت
مجھ پہ احسانِ اہل زر نہ ہوا

حسرت کی ساری زندگی ایسی ہی قربانیوں، آزمائشوں اور سخت امتحانوں کی ایک دلآویز اور بصیرت افروز تاریخ ہے۔ حسرت اس برصغیر کے سب سے پہلے سیاسی رہنما تھے جنہوں نے آزادی کامل کا مطالبہ کیا۔ اور انہوں نے اس مطالبہ کی پوری قیمت ادا کر دی۔ انہوں نے قید فرنگ کی انتہائی وحشیانہ سزائیں قبول کیں لیکن اپنے مطالبہ کی صداقت کا اعلان کرتے ہی رہے اور اس طرح انہوں نے بلالِ حبشیؓ کی روایات کو باقی رکھا۔ اس زمانے کی جیلیں آج کل کی جیلوں کی طرح آرام گاہ (Rest Houses) نہیں ہوتی تھیں کہ لیڈر صاحب کو کھانا دیا جائے۔ اخبارات اور کتابیں مطالعہ کے لیے فراہم کی جائیں اور عزیزوں سے ملاقات کی اجازت ہو۔ اور جب وزن گھٹنے لگے تو معافی مانگ کر رہائی حاصل کر لی جائے۔ جب حسرت نے اپنے لیے در و دیوارِ زنداں کو منتخب کیا، اس وقت قید فرنگ کی صعوبتیں ہفت خوانِ رستم سے کم نہ تھیں۔ ''مشاہدات زنداں'' کے مطالعہ سے ان سزاؤں اور وحشیانہ سلوک کا اندازہ ہو سکتا ہے جو حسرت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انہیں برہنہ کر کے کنویں میں الٹا لٹکا دیا جاتا تھا۔ اور درے مارے جاتے۔ دوسرے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی ایک من گیہوں روز پیسنا پڑتا۔ اس زمانے میں قیدیوں کو خوراک انتہائی کم دی جاتی تھی۔ اور شاید ہی کبھی ان کا پیٹ بھرتا۔ قیدی آکر مولانا کا پسا ہوا آٹا بھوک کی شدت میں کچا ہی کھا لیتے۔ اور جب آٹا تولا جاتا تو حسرت کا آٹا وزن میں کم نکلتا۔ اس کمی کی سزا انہیں خاردار کوڑوں سے دی جاتی۔ لیکن حسرت نے کبھی بھوکے قیدیوں کو آٹا کھانے سے نہیں روکا۔ ایک محفل میں مولانا نے اپنی قمیض اوپر اٹھا کر اپنے جسم پر بیدوں کے نشان دکھائے اور آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ دوسروں کی خاطر ان بیدوں کے کھانے میں جو لذت تھی وہ اپنے اعزاز میں دی ہوئی دعوتوں میں کہاں؟

مولانا کی غیرت، خودداری، استقلال اور عزم ان خوبیوں نے ہماری اجتماعی زندگی کی زلفوں میں موتی پروئے ہیں، اور ان کے یہ محاسن لیلائے آزادی کے رخسار پر غازہ بن کر چمکے ہیں لیکن ان کی ذاتی زندگی ابھی بڑی حد تک نگاہوں سے اوجھل ہے۔ حسرت کے اشعار جتنے نرم و نازک ہیں ان کی زندگی میں بھی یہی نرمی اور نزاکت ہے۔ وہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ضرور بھدے تھے بلکہ بدصورت، لیکن ان کے کردار اور ان کی روح میں غزل کے ایک حسین شعر کے سارے تیور موجود تھے۔

حسرت بہت ہی سادہ مزاج آدمی تھے۔ کانپور میں ان کا مکان احاطہ کمال خاں میں تھا۔ ایک مسجد اور عربی مدرسے سے ملا ہوا، جبھی تو وہ کبھی کبھی کہہ اٹھتے ''یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ خدا ہے''۔ یہ مکان معمولی سا تھا اور پرانی وضع کا۔ ایک تاریک ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد مولانا کے مکان کا دروازہ پڑتا تھا۔ دروازے پر ایک ٹوٹی سی کرسی پڑی رہتی تھی۔ آپ نے آواز دی، مولانا اندر سے نکلے، آکر کرسی پر بیٹھ گئے یا آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے رہے اور اب پوچھ رہے ہیں کہ ''کہیے کیا کام ہے؟''

اس سادگی کے ساتھ مولانا بے حد معصوم بھی تھے۔ شوکت تھانوی شیش محل میں ان کی ریکارڈنگ کا ایک واقعہ تو لکھ ہی چکے ہیں۔ جب لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر مولانا کی غزل کا ریکارڈ تیار کر کے انہیں سنایا گیا تو بہت خوش ہوکر بولے ''ہاں ہاں یہ تو بالکل میری آواز ہے۔ اور یہ کہہ کر مطمئن ہو گئے۔

مولانا جب پہلی مرتبہ ہوائی جہاز سے سفر کر کے کانپور لوٹے تو ہوائی سفر کے تجربات بیان کرتے ہوئے بولے بڑی حیرت کے انداز سے بولے (جیسے وہ سننے والوں کے لیے کوئی بڑا انکشاف کر رہے ہوں)۔ ''ہوائی جہاز بڑی اچھی سواری ہے۔ اس میں دھچکے اور جھٹکے بالکل محسوس نہیں ہوتے۔ ارے صاحب کمال ہو گیا جب میں نے ہوائی جہاز میں چائے پی تو چھلکی تک نہیں''۔

حسرت کی بعض عادتیں بہت عجیب سی تھیں۔ گرمیوں میں وہ کنٹوپ اور لحاف اوڑھ لیتے تھے۔ مئی جون کی سخت گرمیوں میں انہیں اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر ہنسی آجاتی اور اگر مولانا اس مسکراہٹ یا ہنسی کا احساس کر لیتے تو بہت ناراض ہوتے اور کہتے ''تم کیا جانو۔ کنٹوپ اور لحاف اوڑھنے سے خوب پسینہ آتا ہے۔ اور جب پسینہ آجائے تو لحاف ہٹا دینا چاہیئے۔ پھر ہوا بہت اچھی اور ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے''۔

حسرت کی ایک عجیب عادت یہ بھی تھی۔ کہ جب وہ اپنی غزل کسی رسالے کے لیے دے دیتے تو گوند لگا کر بیاض کا وہ صفحہ پچھلے صفحے کے ساتھ چپکا دیتے تھے۔ تا کہ وہ غزل غلطی سے کسی اور رسالے کو نہ دے دیں۔ ۱۹۴۷ء میں میں ایک رسالہ ''مضراب'' ترتیب دے رہا تھا۔ اس وقت مولانا نے مجھے وہ غزل دی جس کا پہلا شعر ہے۔

اے حسن ترے ناز کی خدمت میں قدیمی
حاصل ہے مجھے فخر نیاز ازلی کا

اور پھر غزل کا صفحہ چپکا دیا۔ مضراب بند ہو گیا مجھے پاکستان آنا پڑا۔ تین سال تک غزل میرے پاس رکھی رہی۔ اور آخر ۱۹۵۰ء میں میں نے ''نیا دور'' میں اشاعت کے لیے دے دی۔ ان تین سالوں میں یہ غزل، کہیں اور انہیں شائع ہوئی۔ اس عجیب عادت سے مولانا کی احتیاط اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ دوسرے شعراء سے کتنے الگ تھے۔ جو ایک ہی غزل کو بار بار کئی رسالوں میں چھپواتے ہیں۔

اسی احتیاط کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ حسرت کے پاس جو رسالے یا اخبار آتے تھے وہ ان کو ان چٹوں کے ساتھ حفاظت سے رکھتے تھے جن پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوتا تھا۔ ہر رسالے کی چٹ وہ آل پن سے رسالے کے ساتھ لگا دیتے تھے۔ میں ان سے ''آج کل'' کا سالنامہ ۱۹۴۵ء میں پڑھنے کے لیے لایا۔ بدقسمتی سے رسالے کی چٹ ضائع ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے انہیں رسالہ واپس کیا۔ اس پر چٹ نہ دیکھ کر مولانا بہت ناراض ہوئے۔ انہیں یہ شکایت گھر والوں سے بھی تھی۔ کہ ان کی غیر حاضری میں جو رسالے کھولے جاتے ہیں۔ ان کی چٹیں ضائع ہوجاتیں۔ اس واقعہ کے بعد مولانا مجھے کتابیں پڑھنے کو دے دیتے لیکن رسالے نہ دیتے۔

اسی غیر معمولی احتیاط نے مولانا کے ذاتی کتب خانے کو انتہائی مؤقر اور قیمتی بنا دیا۔ اندازہ ہے کہ ان کے کتب خانہ میں اردو شعراء کے تقریباً چودہ سو قلمی دیوان ہیں۔ مولانا نے اردوئے معلٰی کے ذریعہ بڑے سلیقہ سے شعراء کے انتخابات ملک کے سامنے پیش کیے اور ان کی یہ ادبی خدمت بڑی قابلِ قدر ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے حسرت سے بارہا درخواست کی کہ وہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کو دے دیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد یہ بات ہمارے ادبی اور تہذیبی مستقبل کے لیے اور بھی ضروری ہو گئی ہے کہ ادبی سرمایہ کو محفوظ کیا جائے۔ گزشتہ سال میں خیرسگالی کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے ہندوستان گیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے مجھے حسرت سے اس بارے ہیں بات چیت کرنے

کا اختیار مرحمت فرمایا۔ اور حسرت کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ جس میں اس مسئلہ کے تمام پہلو واضح کر کے کتب خانے کی مناسب اور معقول قیمت بھی پیش کی تھی۔ حسرت کو خود بھی بدلے ہوئے حالات کا اندازہ تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ یہ سرمایہ محفوظ ہاتھوں تک پہنچ جائے چنانچہ وہ تیار ہو گئے لیکن ان کے پاس کتب خانے کی کوئی فہرست نہ تھی۔ اور پاکستان تک ان کتابوں کا لانا بڑا کام تھا۔ اسی لیے مولانا نے اس کے لیے کچھ وقت مانگا اس کے بعد حج سے واپسی پر وہ کراچی میں بھی ٹھہرے۔ یہاں مولوی عبدالحق صاحب قبلہ سے ان کی ملاقاتیں ہوئے اور مولانا کتب خانہ انجمن کے سپرد کرنے کا وعدہ کر کے ہندوستان تشریف لے گئے، مگر ایفائے عہد سے پہلے ہی حسرت ہم سے رخصت ہو گئے۔ دیکھئے اس کتب خانہ کا کیا انجام ہوتا ہے، اور حسرت کے ورثاء کہاں تک اس سرمائے کی حفاظت کر سکیں گے؟

حسرت بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھی۔ اور اس بارے میں وہ عقلیت سے زیادہ ذوقِ معرفت کے قائل تھے۔ اولیائے کرام اور بزرگوں سے انہیں عقیدت تھی۔ یہ عقیدت ''قبر پرستی'' کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف تو حسرت کا یہ دعویٰ کہ ''میں ایک مسلمان کمیونسٹ ہوں'' اور دوسری طرف یہ ''قبر پرستی'' سچ ہے۔

''اک طرفہ تماشا تھی حسرت کی طبیعت بھی''

حضرت غوث الاعظمؒ کے علاوہ ہندوستان کے کئی ولیوں سے حسرت کو بڑی عقیدت تھی اور خاندان فرنگی محلی سے تو انہیں خاص نسبت تھی۔ اسی باعث وہ نوعمر جمال میاں فرنگی محلی کا وہ احترام کرتے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی۔

سرور کائنات حضرت محمدﷺ کی محبت تو حسرت کی رگوں میں خون بن کر رواں تھی۔ انہوں نے بارہ تیرہ حج کیے۔ ایک مرتبہ مولانا نے اپنے سفر حج کے ایک ساتھی سے کہا۔ ''میں حج کرنے کب جاتا ہوں۔ میں اپنے جدِامجد کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے جاتا ہوں۔ راستے میں مکہ پڑتا ہے اس لیے حج بھی کر لیتا ہوں''۔

لیکن حسرت کی مذہبیت محدود اور تنگ نظر نہیں تھی۔ اسلام کی روح رواداری ہے اور حسرت اسی مذہبی رواداری کا مرقع تھے۔ کرشن سے انہیں بے حد عقیدت تھی۔ اگر وہ کلیر اور اجمیر جاتے تو متھرا بھی حاضری دیتے۔

''حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری''

ان کی غزلوں میں بار بار کرشن کا ذکر ملتا ہے۔ یہ محض جلوت کی بات نہیں بلکہ خلوت کا بھی ذکر ہے۔ حسرت کرشن کو حضرت کرشن کہا کرتے تھے اور انہیں اللہ کا برگزیدہ پیغمبر مانتے تھے۔ وہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کہتے کہ اللہ میاں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں کے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجے ہیں۔ ان میں سے بہت کم پیغمبروں کے نام ہمیں معلوم ہیں لیکن جب ہر ملک کے لیے پیغمبر بھیجے گئے تو ہندوستان نے کیا قصور کیا تھا کہ یہ دیس پیغمبروں سے محروم رہتا۔ اور کرشن کی تعلیمات ہم تک جس طرح پہنچی ہیں۔ ان کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ملک کو ہدایت دینے کے لیے آئے تھے۔ کرشن کے علاوہ مولانا، رام اور گوتم کی تعظیم بھی کرتے تھے۔

سچی مذہبیت نے انہیں جہاں رواداری عطا کی تھی وہاں حسرت کی زندگی مساوات انسانی کا ایک رخ تھی۔ حسرت نے غریبوں اور امیروں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ وہ ہر آدمی سے یکساں طور پر ملتے۔ جب وہ یوپی اسمبلی کے رکن ہو گئے تو انہیں سرکاری چپراسی بھی ملا۔ جب سڑک سے دونوں ساتھ ساتھ گزرتے تو ہر اعتبار سے چپراسی مولانا سے بہتر ہوتا۔ اس کا لباس بھی مولانا کے لباس سے اچھا ہوتا۔ اس کے ساتھ مولانا بازار سے سودا لاتے تو اس طرح کہ دونوں کے ہاتھوں میں برابر کا وزن ہوتا اگر چپراسی کے ہاتھ میں ترکاریوں کا تھیلا ہے تو مولانا کے ہاتھ میں گھی کا بگونا۔

دوست نوازی حسرت کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ یاد رکھتے، مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرتے۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا لیکن مولانا اس تناسب اور توازن کے ساتھ ہر ایک سے پیش آتے کہ کبھی کسی کی دلآزاری نہ ہوتی۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ سیاسی کارکن، بڑے بڑے شعراء ادباء، جوا کھیلنے والے، عاشق صفت غنڈے، یکہ والے۔ لیکن حسرت سب کو آہستہ آہستہ اس طور پر متاثر کرتے کہ ان کا فیضانِ نظر زندگی کے رخ کو بدل دیا کرتا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال صوفی سید منصور علی حسرتی ہیں۔ زیادہ تفصیل شاید بعض حلقوں میں تلخ سمجھی جائے اور آج ان کی شائستہ، مخلصانہ اور مہذب زندگی کے ہر رخ پر حسرت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

اب میں حسرت کے ذہنی حسن پرستی اور جمالیاتی ذوق کی طرف بھی چند ہلکے سے اشارے کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سب سے پہلے عاشق تھے اور اس کے بعد کچھ اور۔ ان کی شاعری کی طرح ان کی زندگی بھی عاشقانہ گزری۔ اسی بات پر حسرت کو بڑا ناز تھا۔

ایک دن مولانا کی زندگی اور ادب کے متعلق انہیں سے گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا کہنے لگے ”اردو

کے بیشتر غزل گو شعراء کا کلام شاعرانہ ہے۔ غالب کا کلام بھی شاعرانہ ہے لیکن عاشقانہ شعر کہنا مشکل تر ہے۔ میری بیشتر غزلیں عاشقانہ ہیں''۔ مولانا نے اپنے مقطعوں میں بھی بار بار یہی بات دہرائی ہے۔

حسرت یہ کس کے محبت کا ہے مآل
کہتے ہیں سب جو شاعرِ رنگیں ادا مجھے
طفیلِ عشق ہے حسرت یہ سب مرے نزدیک
ترے کمال کی شہرت جو دور دور ہوئی

مولانا کی عشقیہ زندگی میں مرحومہ بیگم حسرت کا بڑا درجہ ہے۔ وہی ''بنت عم'' بن کر ان کے شعروں میں جھلکتی ہیں۔ اور اسی ''بنت عم'' کے عشق سے اس کے گلابی پیرہن، رنگین عارضی نکہتِ زلف اور جمال سرگرانی نے حسرت کی شاعری کو بہت رنگین بنا دیا ہے۔ لیکن حسرت کی حسن پرستی محدود نہیں وہ دوسرے وقتی مظاہر حسن سے بھی متاثر ہوتے ہیں (اگرچہ مرکزِ جمال ایک ہی رہا ہے) اسی لیے اٹلی کی ژوپا (یہ اسم معرفہ ہے) بھی ان پر مہربان رہی ہے۔ اور ''قرطبہ کی خاتون'' کی لٹیں بھی انہوں نے چومی ہیں۔ لیکن حسرت کبھی اخلاقی حدود سے نہیں گزرے اور بلند ترین جمالیاتی و اخلاقی معیار سے کبھی نہیں گرے۔

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شان رسوائی نہ تھا

آخر میں مولانا حیدر آباد دکن کی ایک خاتون سے بے حد متاثر ہوئے اور اس حد تک کہ ملک دکن ان کے لیے گلزار بن گیا۔ اور باد صبا ان کے لیے دکن سے پیغام لانے لگی یہ سلسلہ غالباً ۱۹۴۰ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک اس نے شدت اختیار کر لی۔ ہمارے غزل گو شعرا عمر ڈھلنے کے ساتھ ہی اپنے نغموں کا اسلوب بدل دیتے ہیں کیونکہ ان کے عشقیہ تجربوں کی بنیاد خلوص پر قائم نہیں ہوتی۔ (عہد حاضر کے ایک مشہور رنگین نواشاعر کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا ہے) لیکن بڑھاپا افکار حسرت کو یخ بستہ نہ کر سکا۔ اس زمانے کی غزلوں میں انہوں نے ''محبوب سر زمین دکن'' ''ن'' اور ''ش'' بسر کا ذکر کیا ہے۔ اس کی مار پھولوں کی چھڑی کہا ہے۔ اور جب اخلاق کے علم بردار چونکے تو حسرت نے ان کی پرواہ نہ کی۔ وہ سیاست اہل جہاں سے بالکل نہ ڈرے اور انہوں نے جواب میں کہا۔

کیا حسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

موسیقی سے حسرت کو خاص لگاؤ تھا۔ اور اس باب میں وہ ذرا آزاد بھی تھے۔ موسیقی ان کے لیے روحانی غذا تھی۔ اور وہ اس غذا کی تلاش میں ''ستارہ'' بار فضاؤں تک پہنچے تھے۔ اور بالائے بام پہنچ کر ان کی بسمل روح موسیقی سے سکون پاتی۔ مولانا کو خود اپنی غزل اچھی آواز میں سننے کا بہت شوق تھا۔ جب ان کی غزل کسی حسین محفل میں انہیں گا کر سنائی جاتی تو وہ بیٹھے جھومتے رہتے۔ اور جب غزل ختم ہو جاتی تو اٹھ کر چلے آتے۔

اب حسرت ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان کے نقوشِ قدم کہکشاں کی طرح چمک چمک کر کہہ رہے ہیں کہ حسرت نے رہ گزر کارواں سے ہٹ کر اپنے لیے نئی شاہراہ تراشی تھی۔ ماہ و سال ان عظمتوں کو اور اجاگر کرنے جائیں گے اور حسرت اپنے کردار اور شاعری کی جنت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

☆☆☆☆☆